C107

What is the ROI Papa?

سی ۱۰۷

آر او آئی کیا ہوتا ہے پاپا؟

’’یہ آر او آئی کیا ہوتا ہے پاپا‘‘ ایک دس سالہ بچے نے اپنے والد سے پوچھا (گریجویٹ اپرنٹس شپ کے زمانے کے ایک پرانے کلاس کے ساتھی تھے) جو نجی سرمایہ کاری کے ماہر تھے والد اکثر اپنے ایپل موبائل پر گفتگو کرتے ہوئے آر او آئی لفظ کا استعمال کرتے تھے، بچہ یہ سن لیتا تھا۔ یہ مینجمنٹ کے ماہر بہت ہی کامیاب افسر تھے اور اپنے پیشے میں ترقی کے لیے چند سالوں سے آمریکہ منتقل ہو چکے تھے۔

والد نے سمجھاتے ہوئے کہا ’’بیٹے آر او آئی Return on Investment یعنی پیسہ لگا کر منافع کمانا ہوتا ہے۔ جب ہم کسی کاروبار کے کام میں پیسے لگانے کا سوچتے ہیں تو ہم حساب لگاتے ہیں کہ کاروبار کے لیے بنیادی ڈھانچہ کھڑا کرنے پر جو پیسے خرچ کیے گئے ہیں، اس کے مقابلے میں ہمیں کل منافع حاصل ہوگا‘‘۔

بچے نے پوچھا ’’پاپا، آپ نے میری دیکھ بھال پر بھی تو پیسے لگا رہے ہیں۔ کھانا، کپڑے، اسکول کی فیس، صحت وغیرہ۔ تو آپ مجھ سے کتنے آر او آئی کی امید رکھتے ہیں؟ اور ویسے دادا جی نے آپ کی دیکھ بھال پر جو خرچ کیا اس سے انھیں کتنا آر او آئی ملا؟‘‘

بچے کو اپنے بوڑھے اور پیار و محبت کرنے والے دادا جی یاد آ گے جو مشرقی اتر پردیش کے ایک چھوٹے سے قصبے میں اپنی بیمار بیوی کے ساتھ اکیلے رہ رہے تھے اور ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ والد، جو ایک حساس انسان تھے کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گے۔ پھر بات بدلتے ہوئے بولے ’’اس بار گرمیوں میں سیر کے لیے کہاں چلیں؟‘‘ وہ پوری رات نہ سو پائے۔

آر او آئی کانفرنس

ایک دفعہ ہم ایک پرئیویٹ مینجمنٹ اسکول گئے تاکہ اس بات پر گفتگو کی جاسکے کہ اسٹریٹجک مینجمنٹ فورم کے تحت ایک متعلقہ موضوع پر کانفرنس کیسے منعقد کی جائے۔ ایس ایم ایف کانفرنسیں اکثر آئی آئی ایف ٹی، آئی آئی ایم اور دیگر زیادہ تر سرکاری اداروں میں منعقد ہوتی تھی کیونکہ وہاں مناسب انفراسٹرکچر اور تعاون مل جاتا تھا۔

دو تین گھنٹے تک مسلسل اور تفصیلی گفتگو کے بعد ہم تقریباً اس بات پر متفق ہو گئے کہ اسکول سیمینار ہال بغیر کوئی پیسہ دیے فراہم کرے گا اور ایس ایم ایف اپنی ویب سائٹ کے ذریعے اس تقریب کی تشہیر کرے گا تاکہ اساتذہ اور دیگر مندوبین کو شرکت کے لیے آمادہ کیا جا سکے۔ جیب سے ہونے والے اخراجات رجسٹریشن فیس کے ذریعے پورے کیے جائیں گے۔ میزبان

ادارے پر تقریب سے متعلق کسی بھی قسم کے اضافی مالی بوجھ کی ذمہ داری نہیں ہوگی۔ ہمیں امید تھی کہ میزبان ادارے کے پچاس سے ساٹھ اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ تقریباً تیس سے چالیس باہر سے مندوبین بھی شریک ہوں گے۔ جب ہم وہاں سے روانہ ہونے لگے تو ڈائریکٹر جو تیس برس پہلے ایک جانے مانے مینجمنٹ ادارے میں ہمارے ہم جماعت رہ چکے تھے نے پوچھا ''ایک اور سوال اس ادارے کو کتنا آر او آئی حاصل ہوگا؟ میں اس تقریب کی حمایت کے حق میں ہوں لیکن انتظامیہ سے منظوری لینے کے لیے مجھے یہ واضح معلومات درکار ہیں''۔ ہم افسردہ ہوکر کہا ''اگر آپ ہمیں مخرج (Denominator) بتا دیں تو ہم شمارندہ (Numerator) بتا کر آپ کی مدد کر سکتے ہیں تاکہ آپ آر او آئی کا حساب لگا سکیں''۔ یہ کہہ کر ہم واپس آ گئے اور یہ سوچنے لگے کہ شاید انتظامیہ کو کانفرنس کے اصل مقصد کا علم ہی نہیں۔

کئی برسوں تک میں اس سوال کا جواب تلاش کرتا رہا خاص طور پر اس وقت جب مینجمنٹ اسکولوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ کیا آر او آئی کا تصور غلط ہے؟ کیا یہ صرف کاروباری حالات تک محدود ہے؟ کیا آر او آئی کی ایک سے زیادہ تشریحات ہو سکتی ہیں؟ کیا بعض حالات میں آر او آئی صفر یا منفی ہوسکتا ہے اور پھر بھی کام جاری رکھنا چاہیے؟ کیا آر او آئی لامتناہی (Infinite) بھی ہوسکتا ہے؟ سبکدوشی کے بعد بھی مجھے ان سوالات کا جواب نہیں ملا یہاں تک کہ ایک دن گھٹنے کی تبدیلی کے لیے مجھے اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ اسی دوران میں نے ایک مقالہ لکھنا شروع کیا آئی سی یو سے آغاز کیا اور ایک ہفتے بعد اسپتال سے رخصت ہونے تک اسے مکمل کر لیا۔ جس سے مجھے آر او آئی کے تصور کے بارے میں کچھ وضاحت حاصل ہوئی۔

ہندوستانی تجربات پر مبنی مختصر کیسز لکھنا

اس کے بعد میری ایک اور سرجری ہوئی جو کئی مہینوں تک ایک تکلیف دہ تجربہ ثابت ہوئی۔ بعض اوقات پوری پوری رات نیند نہیں آتی تھی۔ اس درد سے توجہ ہٹانے کے لیے میں نے ہندوستانی انتظامی تجربات کو مختصر نوٹوں کی صورت میں لکھنا شروع کیا۔ جب پچیس تجربات تحریر ہو گئے تو میں نے تقریباً فیصلہ کر لیا کہ اب مزید نہیں لکھوں گا۔

ایک دن خیال آیا کہ ایک مختصر تحریر ہندوستان کی دوسری علاقائی زبانوں میں ترجمہ کروا کر دیکھوں جو پہلے HinduThe میں شائع ہو چکی تھی۔ میں نے گوگل ٹرانسلیٹ کے ذریعے اس کا ملیالم اور بنگالی میں ترجمہ کیا۔ جب میں نے اسے آئی آئی ایم کوژیکوڈ کے اپنے سابق چیف ایڈمنسٹریٹو افسر دوست کو دکھایا تو انہوں نے کہا ''سر، یہ بہت خراب ترجمہ ہے''۔ بنگالی ترجمہ جب آئی آئی ایم لکھنؤ کے ایک بورڈ ممبر کو بھیجا تو جواب ملا ''ڈاکٹر صاحب، میرا خیال ہے یہ کام کسی پیشہ ور مترجم سے کروانا چاہیے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں انتظام کر دیتا ہوں''۔ پھر میں نے ہندی ترجمہ آزمایا اور محسوس کیا کہ اگر میرے پی جی پی کے طلبہ نے یہ دیکھ لیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ مثال کے طور پر یہ جملہ "When we increased PGP

intake'' کا ترجمہ یوں ہو گیا'' جب ہم نے پی جی پی کا سیون (کھانا) بڑھایا۔ اس کے بعد میں نے یہ تحریر آئی آئی ایم کوژیکوڈ اور آئی آئی ایم لکھنؤ کے دیگر ساتھیوں کو بھیجی۔ ہندی ترجمہ میں نے خود کیا۔ اس طرح یہ تحریر آٹھ ہندوستانی زبانوں میں دستیاب ہو گئی انگریزی، ہندی، تمل، ملیالم، بنگالی، اردو، مراٹھی اور گجراتی۔ یہ ایک خوشگوار احساس تھا کہ آپ کی تخلیق آٹھ زبانوں میں موجود ہو۔ پھر میں نے پوری کتاب کے ترجمے کا سوچا لیکن قیمت پانچ روپے فی لفظ تھی جبکہ کتاب میں تقریباً اٹھائیس ہزار الفاظ تھے۔ یعنی ایک زبان کے لیے تقریباً ایک لاکھ چالیس ہزار روپے اور تمام زبانوں کے لیے دس لاکھ روپے سے زیادہ خرچ آتا۔ اپنی محدود پنشن، خاندانی ضروریات اور طبی اخراجات کے پیشِ نظر میں یہ خرچ برداشت نہیں کر سکتا تھا اس لیے مزید ترجمے کا خیال ترک کر دیا۔ میں نے سوچا'' آخر اتنا خرچ کرنے کے بعد اسے پڑھے گا ہی کون''؟

ان تجربات میں سے بعض غیر معمولی تھے یہ کہ تخلیقی صلاحیت کس طرح اداروں کو وسائل کی شدید کمی پر قابو پانے میں مدد دیتی ہے ہم کیسے مواقع ضائع کر دیتے ہیں ہم کسی کام کو مکمل کرنے کے لیے درکار وقت کا کس قدر غلط اندازہ لگاتے ہیں اور کس طرح پابندیاں بھی بڑے مواقع پیدا کر سکتی ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ایسی کمپنی جو مسلسل خسارے میں تھی اپنی سلور جوبلی کے سال پہلی مرتبہ منافع میں آ گئی اور ایسے اداروں میں ایم بی اے کے داخلوں میں تقریباً راتوں رات اضافہ ہوا جو برسوں تک ایک نشست بھی بڑھانے میں ناکام رہے تھے۔ اور یہ سب کچھ یہاں ہندوستان میں ہو رہا تھا۔

میں بے فکری سے لکھتا رہا اور ان تصوری انکشافات کو شامل کرتے ہوئے درسی کتابیں اور تدریسی مواد بھی تیار کرتا رہا کیونکہ یہ عمل میرے لیے خود ایک سہارا بنتا جا رہا تھا۔ چند سال پہلے میں نے ویب سائٹ چلانا بھی سیکھ لیا تھا۔ میں نے ایک ویب سائٹ کرائے پر لی اور اپنی یہ تحریریں وہاں محفوظ کرنا اور عام مطالعے کے لیے رکھنا شروع کر دی تاکہ اگر کسی کو یہ مفید لگیں تو وہ ان سے استفادہ کر سکتا ہے۔ فیکلٹی ڈیولپمنٹ پروگراموں میں شریک اساتذہ بھی چاہتے تھے کہ یہ تدریسی مواد شائع کیا جائے۔

جب درسی کتاب تیار ہو گئی تو میں نے چند ناشروں سے رابطہ کیا کہ آیا وہ اس کتاب کی اشاعت میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ اس پر غور کرنے کے لیے تیار تھے لیکن عموماً ان کی شرط یہ تھی کہ کتاب پہلے کسی مینجمنٹ اسکول کے نصاب میں شامل ہو۔ میری خواہش اشاعت کی تھی لیکن زیادہ ان کم شہرت یافتہ مینجمنٹ اداروں کے لیے (جہاں طلبہ مہنگی کتابیں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے اور زیادہ تر مقامی کمپنیوں میں ملازمت کا ارادہ رکھتے ہیں) اور ان عملی منتظمین کے لیے بھی جو ملک کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے تھے اور جن کے پاس دو سالہ رسمی ایم بی اے تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں تھا۔ مجھے اپنی جگہ لگا کہ اس سارے عمل میں بہت زیادہ دفتری پیچیدگیاں اور جھنجھٹ ہیں اور میری صحت کی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں اپنی مرضی کے مطابق سب کچھ ہر کام انجام نہیں دے سکتا تھا۔

میں ایک مختصر اور جامع تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل درسی کتاب تیار کرنا چاہتا تھا جو طلبہ اور منتظمین کے لیے دلچسپ اور پڑھنے میں آسان ہو لیکن بعض ناشر اس میں سو سے زائد صفحات مزید شامل کرنا چاہتے تھے تا کہ کتاب خوب نام کمائے۔ میں قیمت کم رکھنا چاہتا تھا لیکن ناشروں کو اس میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے ویب ٹیکنالوجی بہت فائدہ مند لگی کیونکہ میں آرام سے اپنی آرا اور تحریریں اپنی ویب سائٹ پر شائع کر سکتا تھا۔ اگر کوئی پڑھنے کی خواہش رکھتا تو وہ آسانی سے اس کو ڈاؤن لوڈ کر سکتا تھا۔ فروخت کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا بلکہ خیالات کی ترسیل اور چند کتب خانوں تک رسائی تھی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اسے کتابی شکل میں کیسے شائع کیا جائے؟

ایک بار گڑگاؤں میں، میں اپنی تازہ تحریروں کی فوٹو کاپی نکالنے گیا۔ میں نے سیکھ لیا تھا کہ بھاری بھرکم کاغذی مسودے ساتھ اٹھانے کے بجائے انہیں پین ڈرائیو میں محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر جب میں لکھنؤ سے اپنی بیٹیوں کے پاس گڑگاؤں یا بنگلور جاتا تھا۔ میں نے یوں ہی ایک دکان کے مالک سے پوچھا کہ کیا وہ اسے کتابی صورت میں چھاپ سکتا ہے؟ وہ مان گے اور جب اُن کو معلوم ہوا کہ میرا ارادہ کتابیں فروخت کرنے کا نہیں بلکہ تقسیم کرنے کا ہے حتیٰ کہ اگر کسی کو واقعی ضرورت ہو وہ مفت میں لے سکتا ہے۔ یہ جان کر انھوں نے قیمت میں بھی رعایت دی۔ انھوں نے کتاب تیار کی اور یوں میرا مقصد پورا ہو گیا۔ بعد میں جب میں بنگلور گیا اور یہی کام کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہاں ایک ایسا پرنٹر موجود ہے جو خود اشاعتی (Self-Publication) کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور ای بُک کا بھی اپوشن دستیاب ہے۔ مجھے صرف کتابیں تیار کرنی تھی، باقی تقسیم کا کام وہ خود کرتا، ان لوگوں تک جنہیں میں بھیجنا چاہتا یا ان تک جو اسے آن لائن خریدنا چاہتے تھے۔

ویب سائٹ کا کریش: ایک تخلیقی مواقع کی فراہمی

اگرچہ میں اپنی کہانیاں اور کتابیں ویب سائٹ پر ڈال چکا تھا لیکن میرے پاس یہ جاننے کا کوئی راستہ نہیں تھا کہ آیا کوئی ایک شخص بھی انہیں استعمال کر رہا ہے یا نہیں۔ اتفاق سے میری ویب سائٹ میں کچھ تکنیکی مسائل پیدا ہو گئے اور مجھے اپنی تحریروں کی اپ لوڈنگ روکنی پڑی۔ اسی دوران میں فوٹو کاپی بھی نہیں نکال پا رہا تھا کیونکہ میرے پرنٹر کی کارٹریج خشک ہو چکی تھی۔ میں نے کارٹریج بھرنے والے کی تلاش شروع کی۔ خوش قسمتی سے مجھے اپنی بیٹی کی کالونی میں ایک چھوٹی سی دکان مل گئی۔ جب میں دکان کے مالک سے ملا تو معلوم ہوا کہ وہ ویب سائٹ ڈیزائن کرنے اور فروخت کرنے کا کام بھی کرتا ہے۔ میں نے ایک نئی ویب سائٹ بنوالی جو پہلے سے زیادہ استعمال میں بھی آسان تھی اور اس میں یہ سہولت بھی موجود تھی کہ معلوم کیا جا سکے کہ کسی تحریر کو کتنی بار دیکھا یا ڈاؤن لوڈ کیا گیا ہے۔ ان دونوں ویب سائٹس پر دو سال میں میرا کل خرچ تقریباً پچیس ہزار روپے آیا۔

دوسال کے دوران صرف چکرآنے کی وجہ معلوم کرنے کے لیے تین جانے مانے کارپوریٹ اسپتالوں میں ایم آرآئی کرواچکا تھا اوراس پراس سے بھی زیادہ رقم خرچ ہوچکی تھی۔اتنا ہی نہیں میں نے ایک اور غیر متوقع طبی فائدہ بھی محسوس کیا۔میری بیوی کو رات میں نیند نہ آنے کا مسئلہ تھا۔جب بھی انہیں یہ پریشانی ہوتی میں اپنی نئی کہانیوں میں سے چند سطریں بلند آواز سے پڑھ کر ان سے پوچھتا کہ وہ اپنی رائے دے،آیا ان میں کچھ وزن بھی ہے۔ چند ہی منٹوں میں ایک پیراگراف سننے کے بعد وہ گہری نیند سو جاتی۔

چہل قدمی اور غیر ملکی زبان میں کہانی

اسی معذوری کے زمانے میں مئی ۲۰۱۷ میں ایک دن میں کالونی سے باہر معمولی خریداری کے لیے جارہا تھا کہ ایک بجلی کے کھمبے سے تقریباً ٹکرا گیا۔جب میں نے اوپر کی طرف دیکھا تو ایک پوسٹر نظر آیا ''انگریزی، فرانسیسی، ہسپانوی اور جرمن زبان سیکھیے'' اس پر رابطے کے لیے موبائل نمبر بھی دیا تھا۔میں نے اس نمبر پرفون کیا اور پوچھا کہ کیا وہ مجھے ہسپانوی سکھا سکتے ہیں۔ وہ حیران ہوئے انھوں نے مجھے اپنے گھر بلایا جو وہاں تقریباً ایک کلومیٹر دور تھا۔میں ان سے ملنے گیا۔جب انھوں نے ستر سال کے ایک شخص کو دیکھا تو حیران ہوکر پوچھنے لگا'' آپ ہسپانوی یا فرانسیسی کیوں سیکھنا چاہتے ہیں؟'' پھرانھوں نے بتایا کہ زبان سیکھنے میں تقریباً چھ ماہ لگیں گے اور فیس دس ہزار روپے ماہانہ ہوگی۔میں نے کہا مجھے واپس جانا ہے کیا آپ مجھے ان چھ ہفتوں میں سکھا سکتے ہیں؟ وہ مزید حیران ہوئے اور پوچھا آپ آخر سیکھنا کیوں چاہتے ہیں؟اس کی حیرت اور بڑھ گئی جب میں نے جواب دیا ترجمے کے لیے۔انھوں نے کہا کہ چھ ہفتوں میں یہ زبان نہیں سیکھی جاسکتی البتہ وہ ترجمہ کرواسکتا ہے۔انھوں نے پہلے سات روپے فی لفظ قیمت بتائی اور بعد میں اسے کم کر کے پانچ روپے فی لفظ کردیا۔اس کا مطلب یہ تھا کہ اٹھائیس ہزار الفاظ پر مشتمل کتاب کے ترجمے پر تقریباً ایک لاکھ چالیس ہزار روپے خرچ آتے۔

چونکہ میں اس کی استطاعت نہیں رکھتا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ صرف ایک صفحے کی ایک کہانی کا ترجمہ کروالیا جائے جس کی قیمت تقریباً ۲۵۰۰ بھارتی روپے بنتی تھی۔میں نے ان سے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کرنے کی درخواست کی اور پیسے بھی دے دیے۔ایک ہفتے بعد انہوں نے ترجمہ شدہ نسخہ ای میل کیا اور پوچھا کہ کیا وہ مجھ سے ملاقات کر سکتے ہیں۔ملاقات کے دوران انہوں نے کہا کہ وہ اس تحریر سے بہت متاثر ہوئے ہیں اور پوچھا کہ میں پوری کتاب کا ترجمہ کیوں نہیں کرواتا۔انہوں نے رعایتی دام پر 3 روپے فی لفظ کے حساب سے یہ کام کرنے کی پیشکش بھی کی۔میں نے انہیں اپنی سبکدوش زندگی کے بارے میں بتایا اور کہا کہ میں اپنی پنشن سے بمشکل اس کا خرچ اٹھا سکتا ہوں البتہ تقریباً ۵۰۰۰ روپے (یعنی پنشن کا دسواں حصہ) نکال سکتا

ہوں اس سے زیادہ خرچ کرنا میری شریکِ حیات کے اختیار میں مداخلت ہوگی۔ان کا جواب دلچسپ تھا’’ادائیگی کی فکر نہ کریں جب اور جتنا آپ کے لیے آسان ہوادا کر دیجیے‘‘۔

اس کے بعد میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اسی کہانی کا مزید تین زبانوں میں بھی ترجمہ کر دیں جس پر مجموعی طور پر تقریباً ۱۰۰۰۰ روپے خرچ آنا تھا۔یوں میری ایک کہانی ’’ہنو مانز آف انڈیا‘‘ (جو ہندوستانیوں کی پوشیدہ قوت اور کارکردگی کے حیرت انگیز تجربات پر مبنی تھی) اب بارہ زبانوں میں دستیاب تھی۔ یہ میری زندگی کا ایک دلچسپ تجربہ تھا کیونکہ اب اسے دنیا بھر میں ۳۵۰۰ ملین سے زائد افراد پڑھ سکتے تھے اور یہ سب صرف ۱۰۰۰۰ روپے میں ممکن ہوا۔میں نے سوچا ’’(ROI) آخر کیا ہوگا؟‘‘

بدیسی زبان میں کہانی کی کتاب

میں نے سوچا کہ اب یہ کھیل ختم ہو چکا ہے۔لیکن جب میں لکھنؤ واپس آیا تو معلوم ہوا کہ میرے بینک اکاؤنٹ میں تقریباً چار لاکھ روپے جمع ہو چکے ہیں۔ میں حیران ہوا کہ کہیں کسی نے غلطی سے پیسے تو نہیں ڈال دیے۔ کیونکہ نوٹ بندی کے بعد ایسی خبریں اکثر سامنے آتی رہتی تھی۔ تاہم، بینک سے پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ پیسہ کھرا تھا۔ دراصل میں نے ایک میوچل فنڈ خریدا تھا جو اپنی مدت پوری کر چکا تھا اور اس کی رقم میرے اکاؤنٹ میں منتقل ہوگئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اس رقم کا کیا کیا جائے؟ میں نے اپنی اہلیہ سے مشورہ کیا۔انہوں نے کہا جو من چاہیے کرو۔میں نے پوچھا ’’کیا ہم یہ رقم تمام کہانیوں کے ترجمے پر خرچ کر دیں؟‘‘ شاید اس لیے کہ ۱۹۹۲میں بارسلونا سے واپسی کے بعد سے میں یہ کام کرنے کے بارے میں سوچتا رہا۔ بارسلونا نے علمی طور پر میرے سامنے ایک نئی دنیا کھول دی تھی اور میں نے وہاں باہمی تعاون کے بڑے سبق سیکھے تھے۔یورپی یونین نے ہمارے نو ماہ کے دورے کے اخراجات برداشت کیے تھے اور میں تقریباً اتنی رقم بچانے میں کامیاب ہوگیا تھا کہ اپنے خاندان کو ایک ماہ کے یورپی سفر پر لے جاسکوں جو اقتصادی آزادکاری سے پہلے ہمارے لیے ناقابلِ تصور تھا۔

شاید اس احساس کے تحت کہ انہوں نے مجھے کبھی ایسے کام کرنے نہیں دیے جو انہیں ناپسند تھے، انہوں نے سر ہلا کر کہا ’’کر دو‘‘۔ میں بہت خوش ہوا اور اسی رات اپنے اُس دوست کو ای میل بھیج دی جو اس کا ترجمہ کروا رہا تھا ’’آگے بڑھو، پوری کتاب کا فرانسیسی، جرمن، ہسپانوی اور مینڈارن میں ترجمہ کرو (پیسے تقریباً تین لاکھ پچاس ہزار روپے) وقت پر ملے گے‘‘۔ میں نے یہ فیصلہ شاید بیوقوفی میں کیا کیونکہ بعد میں احساس ہوا کہ ٹیکس کی پیچیدگیوں کی وجہ سے ان کتابوں کو فروخت کرنا آسان نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے انہیں مفت رکھا اور ویب سائٹ پر اپ لوڈ کر دیا۔ آئی آئی ایم احمد آباد کے ایک ہم جماعت نے مجھ سے پوچھا ’’اس کا آر او آئی کیا ہے؟ انتظامی نقطہ نظر سے یہ شاید سب سے بیوقوفانہ فیصلہ ہے‘‘۔ میں اپنے اس فیصلے پر تھوڑا شرمندہ ہوا لیکن یہ احساس زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔

مشاہدات اور ڈاؤن لوڈز

ایک دن اتفاقاً میں نے ویب سائٹ دیکھی تو معلوم ہوا کہ وہاں میری تحریروں کو کتنی بار دیکھا اور ڈاؤن لوڈ کیا گیا اس کی گنتی موجود ہے۔ میں نے ان اعداد و شمار کا جائزہ لیا اور نتائج خاصے دلچسپ نکلے۔

میری تمام تحریروں کو مجموعی طور پر بارہ ہزار سے زیادہ مرتبہ دیکھا گیا اور چھ ہزار آٹھ سو سے زیادہ مرتبہ ڈاؤن لوڈ کیا گیا تھا۔ اگر میں روایتی اشاعتی راستہ اختیار کرتا تو بستر تک محدود رہتے ہوئے میرا اس پڑھنے والے حلقے تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ ایک دلچسپ بات یہ سامنے آئی کہ ''دادا جی کی کہانیاں'' (Tales of Grandfather) کے غیر ملکی زبانوں میں ترجموں کو (۵۳۸) مرتبہ ڈاؤن لوڈ کیا گیا جبکہ ہندی اور انگریزی کے مجموعی ڈاؤن لوڈ (۳۵۴) تھے۔ اس سے یہ اندازہ ہوا کہ ہندوستانی تجربات کے لیے عالمی سطح پر ایک غیر استعمال شدہ صلاحیت موجود ہے۔ میں سوچنے لگا ''اگر ترجمہ نہ کیا ہوتا تو کیا میں ان قارئین تک اپنے تجربات پہنچا سکتا تھا؟'' اتفاقاً ترجمے پر خرچ کی گئی رقم جلد ہی تنخواہ پر نظرِ ثانی کے بعد ملنے والی بقایا جات سے پوری ہو گئی جبکہ میرا اپنا ادارہ مختلف پالیسیوں کے ذریعے مجھے اس رقم سے چار گنا زیادہ فائدہ دینے سے محروم رکھتا رہا۔ مجھے یہ پتہ چلا روایتی مالیاتی پیمانوں کے ذریعے آر او آئی کا حساب لگانا مشکل ہے۔

ایک اور دلچسپ بات یہ سامنے آئی کہ درسی کتابوں کے وہ ابواب زیادہ ڈاؤن لوڈ ہوئے جو عام طور پر اسٹریٹجک مینجمنٹ کے لازمی نصاب میں شامل نہیں کیے جاتے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ تحقیقی کتابوں میں دلچسپی درسی کتابوں سے زیادہ دکھائی دی۔ اسی طرح کیس بکس اور انفرادی کیسز میں بھی غیر معمولی دلچسپی دیکھی گئی۔ یہ سب اس وجہ سے ممکن ہوا کہ freebooks.ekhaik.in کے نام سے ایک ویب سائٹ بھی شروع کی گئی۔ اور مجموعی اضافی خرچ تقریباً دو ہزار روپے تھا۔ ایک بار پھر مجھے لگا کہ روایتی مالیاتی اصطلاحات میں آر او آئی کا حساب لگانا آسان نہیں۔

آر او آئی کیا ہے؟

جب لوگ میرے کام کا آر او آئی پوچھتے ہیں تو موجودہ دور کے حساب سے مجھے لگتا ہے کہ یہ صفر یا بہت کم ہے۔ کتابوں کی کوئی خرید فروخت نہیں ہوئی۔ سرمایہ کاری پر کوئی مالی منافع حاصل نہیں ہوا۔ لیکن جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں کہ مجھے یا میرے ادارے کو اصل میں کیا کرنا تھا تو میں بہت خوش ہوتا ہوں۔ ادارہ نے ۱۹۹۳ میں ایک علمی وسائل کے مرکز کے قیام کا منصوبہ بنایا تھا لیکن وہ تقریباً بیس سال تک عملی شکل اختیار نہ کر سکا۔ تاہم، میں ایسے کیسز (Cases) لکھنے میں کامیاب رہا جنہیں ڈھائی ہزار سے زیادہ افراد نے ڈاؤن لوڈ کیا۔ یہاں تک کہ کیس بک کو بھی ۲۲۶ مرتبہ ڈاؤن لوڈ کیا گیا۔ کئی زبانوں میں لکھی ہوئی کتاب کو پانچ سو سے زیادہ مرتبہ ڈاؤن لوڈ کیا گیا۔ حتیٰ کہ تحقیقی کتابوں کے ڈاؤن لوڈ بھی امید سے زیادہ رہے۔ اور سب سے

اہم بات یہ کہ اس کام کے نتیجے میں کم پیسے پر مبنی طلبہ اور منتظمین کے لیے موزوں تعلیمی مواد تیار ہوا وہ خواب جو میں نے ستائیس سال پہلے بارسلونا میں دیکھا تھا۔

یہ سب ادارے کے مقصد سے جڑا ہوا تھا جس میں آئی آئی ایم ایکٹ ۲۰۱۷ کی دفعہ ''۷.جی'' کے تحت کم پیسے میں تعلیمی مواد کی فراہمی بھی شامل ہے۔

آر او آئی کے پیمانوں پر ناکامی کا جو ملا جلا احساس پیدا ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آر او آئی کو کارکردگی کا واحد معیار سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ یہ صرف کارکردگی کی کفایت کو ناپتا ہے۔ لیکن موثریت (Effectiveness) کا کیا؟ یعنی یہ کہ کسی ادارے یا فرد نے اپنے مقصد کے حصول میں کتنی کامیابی حاصل کی جس کے لیے وہ قائم کیا گیا تھا؟ اگر موثریت کے معیار پر جانچا جائے تو نتیجہ خاصا بلند نظر آتا ہے۔

''آر او آئی پر حد سے زیادہ زور دینے کے رجحان نے اسٹریٹجک مینجمنٹ فورم جیسے ادارے کے زوال میں کردار ادا کیا جو اسٹریٹجک مینجمنٹ کے شعبے میں اساتذہ کی ترقی کے لیے غیر معمولی خدمات انجام دے رہا تھا۔ کیا موثریت کی پیمائش نہ کرنا ان عوامل میں شامل ہے جنھوں نے کئی ممتاز اداروں کو ملک کی ضروریات پوری کرنے سے روکے رکھا؟ درحقیقت کاروباری اداروں میں آر او آئی کے بے جا استعمال نے بہت سے غلط کاروباری رویوں کو جنم دیا جہاں حریف حتیٰ کہ بھائی بھی سماج کی بڑھتی ہوئی ضروریات پوری کرنے کے لیے تعاون کے بجائے ایک دوسرے کو ختم کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں''۔ ڈاکٹر نریندر موہن نے سوچا۔

Models Available for Different Users

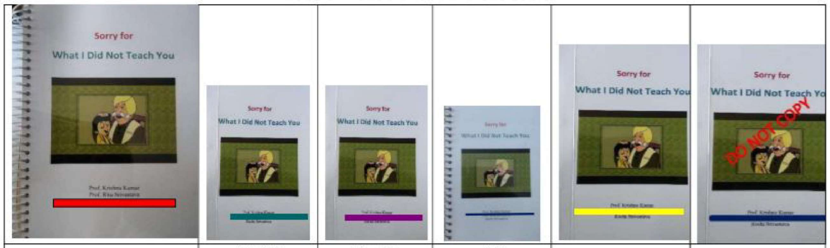

A4 Size 9"x 12"	6" x 9" Matte Finish	6" x 9" Glossy Finish	A5 5.5"x 8.5"	E-book	Free Book
750 gms approx.	350 gms approx.	350 gms approx.	400 gms approx.	ZERO	ZERO
Pages 250 Traditional Xerox Course Material	Pages 250 Handy Convenient to read	Pages 250 Handy Convenient to read	Pages 300 One Blank Sheet after every story for taking notes	Read anywhere any time, any place	Read anywhere any time, any place
INR 300 Low Vision Readers	INR 400 Executive Ed.	INR 300 Economy Ed.	INR 175 Students Ed.	INR 150 Cashback Up to 100% Smart Readers	INR 0 For Perusal